محمد حنیف ندوی

روایت و درایت کے قرآنی پیمانے

اسلامی تاریخ کا یہ اعجاز ہمیشہ مستشرقین کی نظروں میں کھٹکتا رہا کہ اس کے دامن روح پرور میں صرف قرآن ہی کے الفاظ و حروف کو زندہ و محفوظ رہنے کا موقع نہیں ملا۔ بلکہ اس میں ان کوائف و حالات اور ماحول و فضا کا بھی سراغ ملتا ہے کہ جس میں اس کتاب ہدیٰ کا نزول ہوا۔ یہی نہیں اس میں صاحب قرآن سے متعلق بھی ان تمام تفصیلات کا پتہ چلتا ہے کہ جن کو معلوم کئے بغیر فہم قرآن کے تقاضے مکمل نہیں ہو پاتے۔ اس کھٹک کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انہوں نے واقعات کی غلط توجیہہ پیش کی ہے اور احادیث و روایت کے قیمتی ذخائر کو مشکوک ٹھہرانے کی ناکام کوششیں کی ہیں۔ چنانچہ مارگولیتھ شاخٹ اور گب نے تو خصوصیت سے تدوین اور جمع حدیث پر کچھ اس انداز سے اظہار خیال کیا ہے کہ جس سے ان کی نیتوں کی خرابی مخفی نہیں رہ سکی۔ اور ان کی زبان قلم پر آپ سے آپ وہ سب کچھ آ ہی گیا ہے کہ جس کو اخلاص و استشراق کے باریک پردوں میں چھپانے کی سعی کی گئی ہے۔ ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک روایت و جمع حدیث کا تقاضا دین کا کوئی اصلی اور بنیادی تقاضا نہیں تھا۔ بلکہ یہ تو زمانہ مابعد کی فقہی و قانونی ضرورتیں تھیں کہ جن سے نمٹنے کے لیے ایسا کیا گیا ہے۔ یا کچھ کلامی و مناظرانہ بحثیں تھیں جو عجمی اثرات کے عمل دخل سے ابھر آئی تھیں اور ان کو حق بجانب ٹھہرانے یا ان کے لیے دلائل مہیا کرنے کے لیے احادیث و روایت سے استمداد ضروری تھی۔ ورنہ وہ خیالات جو علوم عقلیہ کے فروغ سے پیدا ہوئے تھے مذہبی تائید و حمایت سے محروم ہو جاتے اور مسلمانوں میں قطعی مقبول نہ ہو سکتے۔ اسی طرح نقد حدیث کے بارے میں جس کو ہمارے ہاں جرح و تعدیل یا اصول حدیث کے عظیم الشان فن سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ یہ بھی دین کے کسی اصول کی بنا پر معرض وجود میں نہیں آیا بلکہ اس مجبوری کے پیش نظر مرتب کیا گیا ہے کہ اس کے بغیر موضوع احادیث کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو قابو میں لانا ناممکن تھا جس سے کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو خطرہ لاحق ہو چلا تھا۔ اس فن کی افادیت و عظمت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک طرف تو اس کی بدولت ہزاروں اشخاص کے حالات و سوانح قلمبند ہو گئے۔ ان کے علمی و عملی مرتبوں مرتبوں کی وضاحت ہوئی اور دوسری طرف پہلی مرتبہ روایت کی جانچ پرکھ کے حکیمانہ معیار نظر و فکر کے سامنے آئے۔ اور فلسفۂ تاریخ کی بنیاد پڑی۔

اس مختصر مضمون میں ہمیں بتانا ہے کہ تدوین حدیث اور درایت و نقد کے تقاضے خالص دینی ہیں اور قرآن سے بڑی حد تک ان عوامل و محرکات اور پیمانوں اور معیاروں کی تشریح ہوتی ہے کہ جن کی بنا پر یہ تشکیل پذیر ہوئے۔ مستشرقین کو اگر روایت حدیث اور نقد حدیث کی حیثیت پر گفتگو کرنے کا موقع ملا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایسا ہونا اس بنا پر ناگزیر اور قدرتی تھا کہ دنیا بھر کے ادبی یا روایاتی مرقعوں میں اس کی محکمی و استواری، اس استناد و ثبوت اور اس تفصیل و جامعیت کی مثال نہیں ملتی کہ جو فن حدیث کو حاصل ہے۔ ہومر کو یونانی ادبیات میں کتنی اہمیت حاصل ہے۔ یہ وہ خارقۂ شعری ہے کہ مسیح سے چار پانچ سو سال پہلے ایتھنز کا ہر پڑھا لکھا نوجوان جس کو زبانی یاد رکھنا اپنے لیے بہت بڑا اعزاز خیال کرتا تھا۔ اس کی اصلی قدر و قیمت یہ ہے کہ یہ وہ پہلی اور آخری کتاب ہے جس سے کہ قدیم یونانی صنمیات اور قدیم یونانی فکر و ثقافت پر کامیابی سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ابھی تک بشریات (Anthropology) کے ماہرین اس کی تاریخ تصنیف کی تعیین نہیں کر پائے کوئی مسیح سے چھ سو سال پہلے کا پتہ دیتا ہے اور کسی کے نزدیک آٹھ سو اور چھ سو کے بین بین کوئی زمانہ ہے جو فرض کیا جا سکتا ہے۔ اور سب سے حیران کن اختلاف یہ ہے کہ آیا نظم و شعر کا یہ بحر محیط کسی ایک ہی آسودہ و شاداب ذہن کی طرفہ طرازیوں کا نتیجہ ہے یا اس کی ترتیب و تکمیل میں متعدد شعراء نے حصہ لیا ہے۔ یہی حال بائبل کا ہے اس میں بہت سے صحیفے ایسے ہیں کہ جن کا مستند ہونا مسلم نہیں۔ اور جن میں مذکورہ حالات و واقعات سے خود یہودی علماء بے خبر ہیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم سوال جو محققین کے لیے وجہ خلش بنا رہا ہے کہ زمانۂ اسیری (Captivity) کے بعد جن کتابوں کو عہد نامۂ عتیق کے نام سے پکارا گیا خود ان کا ماخذ استناد کیا ہے۔ بہت ہی قریب زمانے کی مذہبی کتابیں اناجیل اربعہ ہیں انہیں متعدد جعلی صحیفوں سے چھانٹ کر تیار کیا گیا ہے۔ ان میں بے شمار اختلافات ہیں اور اگر ان کے مرتبین کی پیغمبرانہ حیثیت کو تسلیم نہ کیا جائے تو یہ بات ثابت کرنا سخت دشوار ہو جاتا ہے کہ کس حد تک ان میں مسیح کے پیغام و دعوت کی صحیح صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ اور کس حد تک یہ سینٹ پال کے افکار کا آئینہ ہیں۔ ان حالات میں تاریخ اسلامی کی یہ جامعیت اور یہ درجۂ استناد اگر اچنبھا پیدا کرتا ہے اور خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیونکر قرآن کی دعوت کے ساتھ ساتھ صاحب قرآن کا ایک ایک خدوخال محفوظ ہو گیا ہے اور کیونکر روایت و درایت کے اصولوں نے تکمیل و اتمام کے جملہ مراحل کو کامرانی سے طے کر لیا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا بلکہ اگر ایسا نہ ہوتا اور اغیار اس پر شکوک و شبہات کا اظہار نہ کرتے تو اس پر البتہ تعجب ہوتا۔

اس مختصر تمہید کے بعد آیئے اب ان عوامل اور پیمانوں کا جائزہ لیں جن کے مطابق روایت و درایت کے خزائن مرتب ہوئے اور جن کی روشنی میں ان خزائن کی صحت و استناد کی کسوٹیاں مقرر کی جا سکتی ہیں۔ جہاں تک

عوامل کی تعیین کا تعلق ہے سر دست ہم اس سے بحث نہیں کرتے کہ آں حضرتؐ نے کن کن مواقع پر کتابتِ حدیث کی تلقین کی اس سے بھی تعرض نہیں کرتے کہ صحابہ میں کن کن بزرگوں نے حفظ و کتابت کی ذمہ داریوں کو قبول کیا۔ ہمارا موضوع یہ بھی نہیں کہ تابعین نے اشاعتِ حدیث اور تدریس حدیث کے سلسلہ میں کتنی گراں قدر خدمات انجام دیں اور ہم ان کوششوں کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہتے کہ کیونکر ایک صدی کے بعد ہی احادیث کے کئی قابلِ قدر مجموعے تیار ہو گئے اور مالک ابن جریج، اوزاعی، سفیان ثوری اور حماد ایسے ائمہ کبار نے مدینہ، مکہ، شام اور کوفہ میں اس کی اشاعت کے بڑے بڑے مرکزوں کی بنیاد رکھی جن کی وجہ سے مسلمانوں نے آں حضرتؐ کی سیرت و عملی زندگی کے ساتھ اس درجہ اعتناء کیا جس کے سبب انہوں نے ضروری جانا کہ آں حضرتؐ کی زندگی کا ایک ایک پہلو اور آپؐ کے اسوہ و نمونہ کی ایک ایک جھلک مدوّن ہو جائے۔ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ہی تین بنیادی باتیں ہم آسانی سے دریافت کر سکتے ہیں کہ جن سے روایات کی کثرت اور تاریخ اسلامی کی جامعیت و اکمال کی پوری پوری توجیہہ ہو جاتی ہے۔ اور قطعی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس سلسلہ میں دور از کار قصے تصنیف کئے جائیں۔

اوّل۔ آں حضرتؐ کا مرتبۂ محبوبیت

دوم۔ قرآن کا تصورِ نبوت و دین

سوم۔ عربوں کا مزاج روایت پرستی

کون نہیں جانتا کہ تمام انبیاء علیہم السلام اور مصلحین عالم میں یہ شرف تنہا آں حضرتؐ کو میسر ہے کہ آپؐ جس قوم میں مبعوث ہوئے اس کو اپنے سامنے ترقی کرتے، آگے بڑھتے اور کامیابی و کامرانی کے زینوں کو طے کرتے ہوئے بھی دیکھا اور یہ آپؐ ہی کی خصوصیت ہے کہ آپؐ نے صرف تبلیغ و دعوت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی سیرت کو چمکانے اور سنوارنے کی عملی جد و جہد بھی کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیکھتے دیکھتے اس پسماندہ قوم کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہونا شروع ہوئیں۔ اخلاق میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی، عبادات کا عارفانہ ذوق اس میں ابھرا۔ تہذیب و ثقافت کے میدانوں میں فارس و روم ایسے عظیم الشان ملکوں کو اس نے مات دی اور سیاسیات میں ہر بلندی و پستی پر اس کے پرچم لہرائے۔ یہی وہ تبدیلی اور صورتِ حالات تھی جو براہِ راست آں حضرتؐ کی تعلیم و تربیت سے پیدا ہوئی۔ قرآن نے اس کا نقشہ سورۂ فتح کی ان آیات میں نہایت کامیابی سے کھینچا ہے محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم۔ تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ و رضوانا سیماھم فی وجوھم من اثر السجود وذالک مثلھم فی التورۃ ومثلھم فی الانجیل۔

کزرع اخرج شطئہ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ۔

یعجب الزراع بیغض بھم الکفار۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس رسول نے ان لوگوں کو روح و فکر کی پاکیزگیوں میں اتنا اونچا اٹھا دیا ہو، جس نے اس درجہ اصلاح و تربیت کا اہتمام کیا ہو اور جس نے دنیا کی قوموں میں انہیں ہمدوشِ ثریا کر دیا ہو کیا یہ اس کی محبت و عشق میں سرشار نہ ہوں گے۔ اور اس کے ایک ایک عمل اور قول کو سینوں اور صحیفوں میں محفوظ رکھنے کا داعیہ نہ رکھتے ہوں گے۔ جب معمولی فاتحین کی یاد بھلائی نہیں جا سکتی۔ جب ادنیٰ درجہ کے دنیوی سربراہ مستقل بالذات سوانح چاہتے ہیں اور جب علماء و حکماء کے تذکروں تک سے تاریخ کے اوراق و صفحات روشن ہیں تو انسانیت کے اتنے بڑے محسن اور اس کی جملہ ترقیات کے اتنے بڑے حامی و ضامن کے حالات و کوائف کو قلمبند کر لینے کا جذبہ کیا رنگ نہ لایا ہو گا۔

ہمارے نزدیک اگر ایک شخص غیر مذہبی اور غیر دینی نقطۂ نظر سے بھی اسلامی تاریخ کے اس پہلو پر غور کرے گا تو اس کو اس حقیقت کے مان لینے میں ذرا بھی اچنبھا اور حیرت کا احساس نہیں ہو گا کہ یہ ذاتِ گرامی فی الواقع اس توجہ و اعتنا کی مستحق تھی کہ اس کے اقوال و افعال معرضِ تحریر میں آئیں اور اس کے عشاق کا یہ حقیقۃً فرض تھا کہ وہ اس کے اسوۂ عمل کی رعنائیوں کو قلم و لسان کی جنبشوں میں سمو کر دکھائیں۔

مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کو کتنا چاہا اور کس درجہ اپنی محبت و عقیدت کا مرکز قرار دیا اس کا اندازہ سورۂ احزاب کی اس آیت سے کیجئے:

النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم

یہ ایک پیرایۂ بیان ہے اس کے جہاں یہ معنے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ آں حضرتؐ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز جانیں کیونکہ ولایت و نگرانی کا جتنا استحقاق آپؐ کو حاصل ہے اور کسی کو حاصل نہیں۔ وہاں اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ واقع نفس الامری بھی یہی ہے۔ مسلمان آنحضرت سے اس درجہ محبت رکھتے ہیں کہ اس درجہ کی محبت ان کو خود اپنی ذات سے بھی نہیں۔

اب اگر یہی مسلمان اس عشق و تعلق کی بنا پر اس ذاتِ گرامی کے اقوال و ارشادات کو اپنی محفلوں میں دہراتے ہیں، اس کی یاد کو زندہ رکھتے ہیں اور حدثنا و اخبرنا کی شمیم انگیزیوں سے بہرہ مند ہوتے ہیں تو یہ ایک قدرتی بات ہے اور عین تقاضائے عقیدت ہے۔

اب دوسری بات پر غور کیجئے۔ قرآن کے زاویۂ نگاہ سے پیغمبر اور دین کا تصور کس بات کا مقتضی ہے۔ کیا نبوت صرف احکام یا تعلیمات کو من و عن لوگوں تک پہنچا دینے سے تعبیر ہے۔ کیا انبیاء اس لیے مبعوث ہوتے ہیں کہ کچھ احکام و آیات ان پر نازل ہوں تو وہ ان کو جوں کا توں بیان کر دیں اور الفاظ و حروف اور متن سے

آگے نہ بڑھ پائیں۔ یا پیغمبر کی ذات بجائے خود دین کا ایک ضروری حصہ ہے۔ دین کا ایک ناگزیر تقاضا ہے اور دین کا ایک بہت بڑا اور اہم اصول ہے، اور کیا اس کی زندگی، اس کا اسوہ، اس کا عمل اور ایک ایک حرکت و ادا ایسی ہے کہ جس کے تتبع و اطاعت پر کوئی مجبور ہے۔ یا دین کے نظامِ فکر میں اس کی علمی و عملی تشریحات کو کوئی دخل نہیں۔ اور یہ محض ذریعہ اور وسیلہ ہے احکام و آیاتِ الٰہی کے پہنچا دینے کا۔ یہ بنیادی سوال ہے۔ قرآن اس کو کیونکر حل کرتا ہے۔ اس پر تحقیقی نگاہ ڈالنے سے پہلے معاملہ کے اس پہلو پر سوچنا ہوگا کہ مختلف قوموں کی نفسیاتِ اطاعت کی نوعیت کیا ہے۔ کیونکہ قرآن جو حقیقتاً یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے پیغام کو حرزِ جان بنا لیں، اس نزاکت کو ایک لمحہ کے لیے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہمیں سوچنا ہوگا کہ قوموں کی عادات کا کیا انداز رہا ہے اور انہوں نے اپنے قائد مذہبی، اپنے مطاع دین اور امام روحانی سے کیا توقعات وابستہ کی ہیں۔ یعنی ان کے نفسی اطمینان کے حدود کس حد تک وسیع و ممتد رہے ہیں۔ تاریخ کی ورق گردانی کیجئے تھوڑے سے تفحص سے معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے اس کے فکر و عمل میں اور قول میں اور زندگی میں کبھی دوئی فرض نہیں کی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس سلسلہ میں بے فائدہ اور مہمل تجرید سے کام لیا گیا ہو اور فرض کیا گیا ہو کہ ان کا دعویٰ اور نظریہ یا ان کا قول و فکر تو ہمارے لیے حجت ہے۔ لیکن ان کی زندگی ان کا نجی معاملہ ہے اور اس کا کوئی تعلق ان کے پیغام یا دعویٰ سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس ہوا یہ ہے کہ لوگوں نے جب کسی شخص سے عقیدت و ارادت کے رشتوں کو قائم کیا ہے تو ان کی نظر زیادہ تر ان کے اعمال ہی پر مرکوز رہی ہے۔ انہوں نے جب کسی کو چاہا ہے تو اس کی ہر ہر بات کو چاہا اور پسند کیا ہے۔ اور اس سے زندگی و عمل کی ہر ہر خوبی کی توقع رکھی ہے۔ یہی نہیں۔ اس کے اقوال و کلمات کی اہمیتوں کا اندازہ بھی لگایا ہے تو اس سے کہ صبح و شام کی گزرنے والی گھڑیوں میں ان ہدایات کو اس نے کس حد تک برت کر دکھایا ہے۔ کیونکہ عام آدمی اور ایک قائد و مرشد میں یہی باریک فرق تو ہے کہ جہاں اول الذکر زیادہ سے زیادہ کچھ کہنے پر اکتفا کرتا ہے ثانی الذکر جو کچھ کہتا ہے اس کی سچ و صحیح کو سو سو طریق سے اپنے عمل و فعل میں اجاگر کر کے دکھاتا بھی ہے۔ انسان کی اس خوئے اطاعت و تتبع کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ اس نے اکثر ایک عظیم شاعر اور ایک عظیم ادیب سے بھی اسی نوع کی توقعات قائم کی ہیں، اور ان کو بھی ان کے محدود فنی دائروں میں منحصر نہیں دیا۔ بلکہ یہ دیکھنے اور جاننے کی کوشش کی ہے کہ ان دوائر سے باہر ان کے انسان، معاشرہ اور ماحول و فضا سے تعلقات کی کیا نوعیت رہی ہے۔ ایسا ہونا ایک لحاظ سے اس لیے بجا ہے کہ اس کے بغیر ان کے فن کی صداقت سمجھی ہی نہیں جا سکتی۔ اسی اصول کی روشنی میں اب یہ دیکھئے کہ قرآن نے پیغمبر و دین کا کیا تصور قائم کیا ہے۔ اس کو دو طرح سے جانچنا مناسب رہے گا۔ پہلے تو یہ دیکھئے کہ قرآن میں انبیاء علیہم السلام کا ذکر کس طرح ہوا ہے، اور پھر اس نکتہ پر توجہ و التفات کو مرکوز کیجئے کہ خود آں حضرتؐ کا مقام کیا

ہے آیا ان کی حیثیت دین میں خود دین سے الگ ایک ایسے شخص کی ہے جس کے ذمہ قرآن کو پہنچا دینا ہے اور بس اور اس سے زیادہ وہ اور کسی توجہ و اعتنا کا مستحق و سزاوار نہیں۔ یا قرآن اور رسول دونوں مل کر اس تصور کی تشکیل کرتے ہیں جسے ہم دین کہتے ہیں اور دونوں کی اطاعت یکساں طور پر مقصود و مطلوب ہے۔ اور اطاعت و تتبع متقاضی ہے اس بات کی کہ ایسے شخص کی ہر ہر کیفیت کو معرضِ تسوید میں لایا جائے۔ جہاں تک سوال کے پہلے حصہ کا تعلق ہے اس حقیقت سے ہر وہ شخص واقف ہے جس نے قرآن کے مضامین کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے کہ اس میں انبیاء کا ذکر صرف ان تعلیمات و احکام کے سیاق میں ضمنی حیثیت سے نہیں ہوا کہ جو ان پر نازل ہوئے بلکہ ان کی حیثیت ہر جگہ ہدایت و رہنمائی کے ایک مستقل ادارہ ([illegible]) و مرکز کی ہے اور مطاع اور مقتدیٰ کی ہے اور ایک ایسی جامع شخصیت کی ہے جو دین کے ہر ہر معاملہ میں حجت و سند ہے۔ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ۔

یہاں رفع وہم اور ازالۂ شک کے لیے ضروری ہے کہ "باذن اللہ" کے مفہوم کو سمجھ لیا جائے۔ بعض بر خود غلط عناصر اس کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ جن جن احکام کی تصریح و اذن قرآن میں موجود ہے۔ یا ان انبیاء کے صحیفوں میں درج ہے۔ اطاعت بس اسی حد تک محدود ہے۔ اس سے آگے نہیں۔ یا یہ اطاعت گھوم پھر کر آیات و احکام ہی سے متعلق ہے اور انبیاء و رسل کا ذکر محض بربنائے بیت ہے۔

یہ مفہوم قرآن کے مطالب میں صریح مداخلت ہے اور اسے تحریف سے کم درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ یہاں باذن اللہ سے مقصود یہ ہے کہ انبیاء و رسل کی جس اطاعت پر لوگوں کو ابھارا گیا ہے، وہ ماذون ہے۔ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے اور اس کی حیثیت ایک سرسری مسئلہ کی نہیں بلکہ مؤکد و مُوَفق اصول کی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ دین کے انحطاط کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ذوقِ عربیت کا بھی انحطاط ہوا ہے۔ یا شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ عربیت کے ذوق صحیح سے تہی ہونے کی وجہ سے تحریف معنوی کے متعدد دروازے کھل گئے ہیں اور اب یہ حال ہو گیا ہے کہ جو جس کے منہ میں آتا ہے بغیر کسی ذمے داری اور جھجک کے کہتا ہے، اور کہتا بھی نہیں منوا تا اور داد طلب نگاہوں سے مریدوں کی طرف دیکھتا ہے ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ باذن اللہ کے یہ معنی لیے جاتے۔ اگر ان کا بتایا ہوا مطلب درست ہوتا اور قرآن کا بھی یہی مقصود ہوتا تو آیت کو یوں ہونا چاہیئے تھا:

وما ارسلنا من رسول لیطاع الا باذن اللہ

ان دونوں اسلوب ہائے بیان میں معنی و تاویل کا جو تفاوت ہے وہ کسی بھی جاننے والے سے مخفی نہیں، اور اگر یہ اصول صحیح ہے کہ ہر طرح کے قولی و لفظی اصولوں اور حکموں کی وضاحت عمل سے ہوتی ہے، اور زندگی و حیات یا تجربہ ہی وہ کسوٹیاں ہیں کہ جن پر کسی قانون و ضابطہ کی صحت موقوف ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ انبیاء علیہم السلام کے تجربات، ان کا عمل، اور ان کی تطبیق و وضاحت، اتنی ہی ضروری چیزیں ہیں جس قدر کہ خود متن کتاب اور کتاب میں

مندرجہ احکام و تصریحات ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سابق انبیاء کا جب ذکر کیا ہے تو صرف ان کی تعلیمات کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ محض الہامات ہی کو نہیں دہرایا بلکہ ان قوموں کا بھی تذکرہ کیا ہے جن میں وہ مبعوث ہوئے اور ان حالات و کیفیات اور گرد و پیش کو بھی بیان کیا ہے کہ جن سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کے مشن اور دعوت کی ٹھیک ٹھیک تفصیلات سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں۔ اور اگر یہ درست ہے اور یقیناً درست ہے تو اس کا صاف صاف مطلب یہ ہوا کہ دین یا مذہب کا صحیح اور سمجھ میں آنے والا نقشہ مرتب کرنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ خود پیغمبر کی زندگی، اس کا عصر، اس کے تقاضے اور حالات و کیفیات کا پورا پورا جائزہ لیا جائے۔ اس سلسلہ کا پُرلطف نکتہ یہ ہے کہ مختلف قوموں نے اپنے اپنے دور اور زمانے میں بعینہٖ یہی کیا بھی ہے۔ تورات یا بائبل کے دونوں حصے آپ کے سامنے ہیں۔ سردست اس بحث میں نہ پڑیئے کہ یہ غیر مستند ہیں جیسا کہ ہم بتا آئے ہیں۔ صرف یہ دیکھئے اور بتایئے کہ یہ اگر انبیاء اور ان کی تاریخ و سوانح نہیں ہیں تو اور کیا ہیں۔ ہمارے اس نکتہ کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ خود یورپ کے اکثر محققین بائبل کو اس سے زیادہ حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں کہ یہ گذشتہ قوموں کی روحانی اور مذہبی زندگی کے ارتقاء کی ایک داستان ہے۔

ہو سکتا ہے اس مرحلہ پر ایک گروہ یہ کہے کہ ہم ماحول اور گرد و پیش کی ضرورتوں کو تسلیم کرتے ہیں اور اس حقیقت کے مان لینے میں بھی کوئی تامل نہیں کہ کسی پیغمبر کے پیغام کو سمجھنے کے لیے اس کے دور و عصر کی جزئیات کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ مگر اس کا کیا علاج ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں کسی چیز کی بھی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا اور صرف قرآن اور تنہا قرآن کے بارہ میں فرمایا ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون۔

ہم اس کے جواب میں صرف اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ اگر حفاظت قرآن کے ضمن میں اس کی تشریحات نہیں آتیں اور اس میں وہ توضیحات داخل نہیں کہ جو آں حضرتؐ نے قول و عمل سے فرمائیں تو صرف متن قرآن کی حفاظت و صیانت کے کیا معنی رہ جاتے ہیں اور کیا کسی پیغام کی حفاظت اور کسی انقلابی اور عظیم دعوت کی نگرانی سے اس قدر مطلوب ہوتا ہے کہ اس سے متعلق ایک اصولی متن تو محفوظ ہے مگر دوسرے جملہ توضیحی اور تشریحی عناصر غائب ہیں کہ جن سے اس کے مجملات کی تفسیر ہوتی ہے۔ اس کے عمومات کے مواقع اطلاق پر روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں فلاں حکم و امر نے عملی جامہ اختیار کرتے وقت کیا متعین شکل اختیار کی۔ ہماری ناقص رائے میں تو جہاں تک معاشرہ کی عملی ضرورتوں کا تعلق ہے نہ صرف تعبیر و تاویل اور تشریح و وضاحت کا وہی پایہ ہے جو متن کا ہے بلکہ بسا اوقات بعض وضاحتیں اس اہمیت کی حامل ہوتی ہیں کہ ان کے بغیر متن کتاب اور اصول اپنی افادیت کھو دیتے ہیں۔ لہٰذا اس آیت کا صحیح صحیح مطلب یہ ہے کہ قرآن نے دین کے نام سے جو نظام حیات پیش کیا ہے وہ قیامت تک کے لیے اپنے تمام لوازم تشریحی کے ساتھ محفوظ ہے اور ہر ہر دور میں استفادہ کے

لائق ہے۔

الم تر کیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃً طیبۃً کشجرۃٍ طیبۃٍ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء توتی اکلھا کل حین۔

آیئے اب سوال کے دوسرے حصے پر غور کریں کہ خود آں حضرتؐ کا قرآن میں مقام کیا ہے؟ اب تک جو بحث ہوئی اس کا تعلق انبیاء کے عمومی تصور سے تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس سے بھی ایک گونہ آں حضرتؐ کے مقام و موقف کی وضاحت ہوتی ہے۔ مگر یہ مسئلہ پوری روشنی میں اس وقت داخل ہوتا ہے جب خصوصیت سے آں حضرتؐ کی ذاتِ گرامی سے متعلق غور کیا جائے۔ کیونکہ قرآن حکیم نے جس تفصیل، جس وسعت اور تعیین کے ساتھ آں حضرتؐ کے منصب اور اس کے متعلقات پر روشنی ڈالی ہے، قدرتاً دوسرے انبیاء کے بارے میں اس درجہ روشنی نہیں ڈالی۔ یوں بھی آپؐ کی ذاتِ گرامی نبوت کا صحیح پیمانہ ہے۔ اور اس پیمانہ و معیار سے ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکے گا کہ رسالت و وحی کے حدود کہاں سے کہاں تک ممتد ہیں، اور اس میں کیا چیزیں داخل ہیں، اور کیا داخل نہیں۔ یہ موضوع بہت وسیع ہے اور کسی مختصر مقالے کا متحمل نہیں۔ اس لیے ہم یہاں اپنی بحث کو صرف ایک ہی نکتہ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ سر دست وحی کی حقیقت پر غور کر لیا جائے اور قرآن کے نقطۂ نظر سے یہ دیکھ لیا جائے کہ کیا یہ کوئی (Mechanical) چیز ہے یا ایک چشمۂ فیض ہے جو ذہن و فکر کے تمام گوشوں کو سیراب کرتا ہے۔ اگر اس کے معنی ایک تنگ دائرے سے متجاوز نہیں اور صرف قرآن کے الفاظ و حروف تک ہی سمٹے ہوئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وحی و رسالت نے پیغمبر کے قلب و ذہن کو کسی سانچہ میں نہیں ڈھالا، اس کی فکر کو متاثر نہیں کیا اور اس میں کسی مجتہدانہ بصیرت کو بیدار نہیں کیا۔ اور وحی و الہام کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ متعلقہ عبارات و آیات کا نزول ہے اور بس۔ یہ نبوت کا مکینکل تصور ہے۔ اس کے برعکس ایک تصور وہ ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کہ وحی ایک نور ہے، ایک روشنی ہے جس سے کہ پورا نہاں خانۂ شعور مستنیر ہوتا ہے۔ ایک بیداری ہے قلب و ضمیر کی۔ ایک تبدیلی ہے۔ ذہن و فکر کا ایک سانچہ ہے جس کو عنایتِ الٰہی نے مہیا کیا ہے اور جب تک یہ قلب و ضمیر، یہ فکر و شعور اور یہ ذہنی سانچہ صحیح ہے اس کے فیوض کبھی ختم نہیں ہوتے۔

(باقی)